استادی

طاہر جاوید مغل

محبت کے بغیر زندگی کا تصور بہت بیزار کن ... اجاڑ... بیابانوں جیسا ہے... اس کی زندگی میں اچانک ہی تبدیلی کی ایک لہر رونما ہوئی... اور پھر اس کے شب و روز بدلتے چلے گئے... اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ ان دیکھی محبت کا خمیازہ کتنا دردناک اور انجام دگرگوں ہوتا ہے... ایک متحرک... تر و تازہ اور توانا نوجوان کی دلچسپ و شگفتہ سرگزشت... جسے محبوبہ کے ساتھ ساتھ ایک استاد کی رہنمائی بھی مل گئی تھی...

آپ کے محبوب لکھاری کی
تازہ ترین تحریر جو تادیر آپ کے
دل پر مسکان اور ذہن کو جکڑے رکھے گی

وہ ستمبر کی ایک خوشگوار شام تھی۔ ساری بات ایک "میسج" سے شروع ہوئی۔ اپنے فون پر یہ میسج دیکھ کر میں تھوڑا حیران بھی ہوا تھا، لکھا تھا۔ "کیا آپ اکیلے اور اداس ہیں؟"

اگر یہ میسج کسی لڑکی کا تھا تو میں یقیناً اکیلا اور اداس ہی تھا۔ اداسی ظاہر کرنے کا اس سے بہتر موقع اور بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس جواب کے بعد ایس ایم ایس کے ذریعے سوال و جواب کا ایک طویل سلسلہ

شروع ہوا۔ اس نے اپنا نام عافیہ بتایا اور وہ تمام اشارے دیے جن سے پتا چلا کہ یہ سلسلہ آگے بڑھ سکتا ہے۔

یقیناً یہ ایک خوب صورت تصور تھا۔ اَن گنت خوش خیالیاں ذہن میں ادھم مچانے لگیں۔ نرم گرم گفتگو، سیر سپاٹا، آنکھ مچولی اور پھر قربت کے لمحے۔ لیکن یہ سب کچھ ایک خاص چیز سے مشروط تھا اور شرط یہی تھی کہ یہ عافیہ واقعی لڑکی ہو اور اپنے بیان کے مطابق تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہو اور میرے گمان کے مطابق خوب صورت بھی ہو۔

بہرحال ہمارے ٹیلی فونک رابطے کا سلسلہ جاری رہا۔ میری سب سے پہلی خواہش یہی تھی کہ میں اس کی آواز سنوں۔ آواز کے بعد یقیناً شکل دیکھنے کی باری آتی اور پھر دیگر ''باریاں'' درجہ بدرجہ...

میں لاہور کی ایک اچھی یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا تھا۔ والد صاحب کا قالینوں کا مناسب کاروبار تھا۔ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے مجھے لاڈ پیار میں سے بھی زیادہ حصہ ملا ہوا تھا۔ والدین نے لڑکی کی پسند والا معاملہ بھی مجھ پر ہی چھوڑ رکھا تھا۔ یعنی وہ سارے حالات موجود تھے جو ایک اچھی ڈراما سیریل شروع کرنے کے لیے ہیرو کو درکار ہوتے ہیں۔

عافیہ سے رابطہ ہونے کے قریباً دو ہفتے بعد میں نے پہلی بار اس کی آواز سننے میں کامیابی حاصل کی۔ آواز خوب صورت تھی اور جوان بھی۔ اب صبر مزید مشکل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت سے پریشان کن خیالات بھی ذہن میں آتے رہے تھے۔ آواز تو ریڈیو آرٹسٹس کی بھی بڑی خوب صورت ہوتی ہے لیکن وہ سارے حسین و جمیل تو نہیں ہوتے۔

بہرحال خدا خدا کر کے چھوٹے چھوٹے کئی دیگر مرحلے طے ہوئے اور ایک روز جناح گارڈن کی پہاڑی کے ایک پہلو میں میری اور عافیہ کی ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔ وہ نومبر کی ایک چمکیلی دوپہر تھی۔ اس دوپہر میں، میں نے جس لڑکی کو عافیہ کے روپ میں دیکھا، وہ اس دوپہر سے بھی زیادہ چمکیلی اور شفاف تھی۔ درحقیقت صورت نے اس کی آواز کو اور آواز نے صورت کو دو آتشہ کر دیا تھا۔

اس کے بعد کا سفر ہم دونوں نے بڑی تیزی تیزی طے کرنا شروع کیا۔ وہ مجھے کامران کے بجائے کامی کہہ کر بلانے لگی۔ میں اسے عافیہ کے بجائے عافی کہنے لگا۔ عافی کے بیان کے مطابق وہ جہلم کی رہنے والی تھی۔ یہاں پڑھائی کے سلسلے میں اپنی بڑی خالہ کے پاس قیام پذیر تھی۔ عافی کے تایا جان وحید مختار صاحب جہلم میں گورنمنٹ سرونٹ تھے۔ سڑکیں بناتے تھے اور کبھی کبھی غصے میں ہوتے تھے تو بنی ہوئی سڑکوں کو ادھیڑنا بھی شروع کر دیتے تھے۔ کئی سال پہلے اپنے والدین کی حادثاتی موت کے بعد سے عافی اپنے تایا جان کے پاس ہی رہتی تھی۔ اب پتا نہیں کہ عافی کی بیان کردہ ان معلومات میں سے کتنی درست تھیں۔

بہرحال ہمارا معاملہ مسلسل آگے بڑھتا رہا جیسے کوئی ٹرین اسٹیشن سے نکلنے کے بعد دھیرے دھیرے رفتار پکڑتی ہے اور پکڑتی ہی چلی جاتی ہے۔ ایک دفعہ جب ٹرین اپنے ہلارے میں آ جاتی ہے تو پھر کسی موٹر سائیکل یا کیری ڈبے کی طرح اسے ایک دم نہیں روکا جا سکتا۔ اگر اسے روکنا بھی ہو تو آہستہ آہستہ رفتار کم کرنا ہوتی ہے۔ بریک اپلائی کرنے پڑتے ہیں۔ اگر ٹرین ایک دم روک دی جائے تو پھر ٹرین، مسافروں اور پٹری وغیرہ کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے وہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ یوں لگا کہ دنیا اندھیر ہو گئی اور اب محبت کے شہیدوں میں نام لکھوانے کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔

اس دن اچانک ہی عافی کا فون آیا تھا۔ یہ کال اس نے اپنے سیل فون کے بجائے، ایک پی سی او سے کی تھی۔ اس نے ہانپتی ہوئی لرزاں آواز میں بس اتنا کہا۔ ''کامی! بہت بُرا ہوا ہے۔ خالو جان نے میرے سیل فون پر میرے اور تمہارے میسیج پڑھ لیے ہیں۔ انہوں نے جہلم سے تایا ابو کو بلا کر فون ان کے حوالے کر دیا ہے۔ جو مجھ پر بیتی ہے، میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ بس اتنا کہنے کے لیے ہی فون کیا ہے کہ اب میرا انتظار نہ کرنا۔ ہمارا ساتھ شاید بس اتنا ہی تھا۔''

میں گنگ ہو کر رہ گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس موقع پر مشہور فلمی ہیروز نے کون کون سے مشہور ڈائیلاگ بولے لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ جو بات دل سے نکلتی ہے، وہ اثر رکھتی ہے۔ میں نے بس اتنا ہی کہا۔ ''عافی! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ اب کم از کم میرے پاس تو واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''میں کیا کروں کامی! میں بالکل مجبور ہو گئی ہوں۔ مجھے تو یہی لگ رہا ہے کہ تایا ابو ایک دو دن میں مجھے واپس جہلم لے جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ...'' اس کی آواز گلے میں اٹک گئی۔

''کیا ہو سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری شادی بڑی جلدی قادر سے کر دی جائے گی۔ تایا ابو، تائی امی، خالہ، چچا سب بہت غصے میں ہیں۔ میں تمہیں زیادہ دکھ دینا نہیں چاہتی اس لیے ہمت کر کے

تمہیں ابھی سب کچھ بتا رہی ہوں۔ اب ہمارا ملنا ممکن نہیں ہے۔ یہ چھری ہمارے گلے پر پھرنی ہی پھرنی ہے اس لیے جتنی جلدی پھر جائے اتنا ہی اچھا ہے۔'' وہ سسک پڑی۔

''میں ایسا نہیں ہونے دوں گا عافی! تم مجھے اپنا...''

مگر دوسری طرف فون بند ہو چکا تھا۔ میرے ساتھ وہی کچھ ہوا جو دلیپ کمار اور ندیم کے ساتھ کم و بیش دس فلموں میں انٹرویل سے پہلے پہلے ہو چکا ہوتا ہے۔ ہیروئن بچھڑ جاتی ہے اور ہیرو کو اس کا اتا پتا معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن میرے پاس اتنا پتا تو تھا کہ عافی مدینہ کالونی میں کہیں رہتی ہے۔ مدینہ کالونی بہت بڑی نہیں تھی مگر اتنی چھوٹی بھی نہیں تھی کہ میں ایک ایک دروازے پر دستک دے کر عافی کے تایا سے شرف ملاقات کی توقع رکھتا۔ اس کام میں چھ سات مہینے تو لگ جاتے اور عافی کی شادی قادر سے یقیناً اتنی رکنے والی نہیں تھی۔ قادر کے بارے میں عافی نے پہلی باتوں میں یہی بتایا تھا کہ وہ اس کے تایا کے دوست کا بیٹا ہے اور کافی عرصے سے ان کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ میں اسی روز مدینہ کالونی جا پہنچا۔ رات گئے تک گلیوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ سینے میں آگ روشن تھی اور دل میں یہ امید تھی کہ شاید کہیں عافی کا کوئی کھوج مل جائے۔ نظر بیسیوں بار موبائل اسکرین کی طرف بھی اٹھ چکی تھی مگر ناامیدی کی گھٹا ٹوپ تاریکی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اگلے روز اور اس سے اگلے روز بھی میں نے گلیوں میں چکراتے ہوئے گزارا۔ مدینہ کالونی صحرا تھی اور میں مجنوں کے روپ میں بھٹک رہا تھا۔ تیسرے روز دوپہر کے وقت میں اچانک ٹھٹک کر رہ گیا۔ ٹریفک کے اشارے پر میں نے ایک نیلی کرولا کار میں عافیہ کو دیکھا۔ وہ بڑی اداس نظر آ رہی تھی۔ کار میں ایک دو اور افراد بھی تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ میری طرف دیکھتی یا میں اسے متوجہ کرتا، اشارہ کھل گیا اور گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میں نے گاڑی کا نمبر پڑھنے کی کوشش کی مگر وہ بھی ادھورا ہی پڑھ سکا۔ گاڑی ٹریفک میں گم ہو گئی۔ بہرحال، اتنا معلوم ہو گیا کہ یہ جہلم کا نمبر ہے۔

☆☆☆

اب میں کشتیاں جلا کر جہلم جا رہا تھا (میں نے جس طرح کشتیاں جلائی تھیں، ان میں یقیناً میرا ایک سیمسٹر بھی شامل تھا) میں بذریعہ بس لاہور سے جہلم کے لیے روانہ ہوا۔ خوش قسمتی میں نے جس بندے کے ساتھ سیٹ شیئر کی، وہ بڑا انوکھی قسم کا تھا۔ جسم دبلا پتلا تھا۔ عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ کلین شیو، آنکھوں پر ہلکا سیاہ چشمہ، سر پر پی کیپ۔ وہ مسلسل مجھے شک کی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے میں ابھی جیب سے کوئی ہینڈ گرینیڈ قسم کی چیز نکالوں گا اور بس والوں کو یرغمال بنالوں گا یا پھر کسی طرح کا آتشیں ہتھیار نکال کر اس شخص کی پسلیوں سے لگا دوں گا اور اغوا برائے تاوان کا مرتکب ہو جاؤں گا۔

آخر میں نے زچ ہو کر ان صاحب سے پوچھا۔ ''آپ میری وجہ سے پریشان تو نہیں؟''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''آپ مسلسل میری طرف دیکھ رہے ہیں۔''

''تو دیکھنا کیا جرم ہے؟'' وہ ہولے سے مسکرائے۔

اس کے بعد ہماری باتوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو ختم ہونے میں نہیں آیا۔ میں جنہیں خاموش طبع سمجھ رہا تھا، وہ جب بولے تو گفتگو کے دریا بہا دیے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر میں انہیں اپنے بارے میں تقریباً سب کچھ بتا چکا تھا۔ جواباً انہوں نے بھی کافی کچھ بتایا۔ وہ تاحال غیر شادی شدہ تھے۔ لکھنے پڑھنے کے شوقین تھے۔ کسی وقت مارشل آرٹ سے بھی تھوڑی بہت دلچسپی رہی تھی۔ دنیا میں ان کا بس ایک بھائی تھا۔ وہ کاروباری شخص تھا۔ یہ حضرت جن کا اپنا نام حسنات تھا، اپنے آبائی مکان میں ایک ٹیوشن اکیڈمی چلا رہے تھے۔ بڑی مزاحیہ گفتگو، بڑی سنجیدگی سے فرماتے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی حرکات و سکنات پر جاسوسی ادب کا اثر ہے۔

جب میں نے انہیں عافی کے بارے میں اور اس کے تایا کی زبردستی کے بارے میں بتایا تو جلد ہی کسی سرکاری سراغ رساں کی طرح ان کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ وہ پُرسوچ انداز میں بولے۔ ''ایسے کیسوں میں عموماً تایا یا چچا وغیرہ کا ذاتی مفاد بھی ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ... ان تایا صاحب کا کوئی بیٹا ہو، کوئی نکما اور مجہول سا بیٹا جس سے وہ عافیہ کی شادی کرنا چاہتے ہوں تاکہ اس یتیم لڑکی کی ساری جائداد ان کے قبضے میں آ سکے؟''

''مجھے تو ایسا نہیں لگتا جی... اور نہ ہی یہ لگتا ہے کہ عافی کے والدین اس کے لیے کوئی بہت زیادہ پراپرٹی چھوڑ کر گئے ہیں۔''

''لیکن بیٹا جی، خوب صورتی بھی تو پراپرٹی ہی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ عافیہ کی خوب صورتی سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں۔ اپنے مجہول سے، بدصورت سے

بیٹے کے لیے ایک خوب صورت دلہن اینٹھنا چاہتے ہوں۔" وہ مجھ سے چند سال ہی بڑے ہوں گے لیکن مجھے بیٹا جی فرمارہے تھے۔

میں نے کہا۔ "پتا نہیں کہ ان کا بیٹا ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو بدصورت بھی ہے یا نہیں۔"

ان کی گندمی پیشانی کی لکیریں کچھ اور گہری ہوگئیں۔ ذرا دیر مراقبے میں رہنے کے بعد انہوں نے خیال آفرینی کی۔ "یہ عافیہ کے تایا کا بیرونِ ملک تو آنا جانا نہیں ہے؟"

"میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ مجھے ان کے بارے کچھ معلوم نہیں۔ شکل بھی نہیں دیکھی میں نے ان کی۔"

وہ بدستور پُرسوچ انداز میں بولے۔ "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ کیا پتا وہ شخص مجرمانہ ذہن رکھتا ہو۔ ایسے لوگ منشیات کی اسمگلنگ کے لیے لڑکیوں کو... خاص طور پر خوب صورت لڑکیوں کو چارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔"

"لیکن وہ ان کی سگی بھتیجی ہے جی۔"

"محبت اور جرم میں سب کچھ جائز ہوتا ہے بیٹا جی۔" انہوں نے محاورے کی ٹانگ توڑتے ہوئے کہا۔ "ان لوگوں کے نزدیک رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک سب کچھ ان کا گروہ یا مافیا ہی ہوتا ہے۔ مافیا سمجھتے ہو تم؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولے۔ "آج کل ایسے کیس بہت عام ہو رہے ہیں... تم اس مافیا والے چکر کو اپنے ذہن سے مت نکالو۔"

"ٹھیک... ٹھیک ہے جی لیکن جو کچھ عافیہ نے مجھے بتایا تھا، اس کے مطابق اس کے تایا نے اس کی شادی اپنے ایک قریبی دوست کے بیٹے سے کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔"

"دیکھا... تمہیں کہا تھا نا۔ اس معاملے میں کوئی ہیر پھیر ضرور ہے۔ یہ عافیہ کے تایا کا دوست یقیناً کوئی بہت بڑا کاروباری شخص ہوگا یا پھر سرکاری افسر ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ قرضے وغیرہ دیتا ہو یا پھر ایکسائز اور ٹیکسیشن وغیرہ میں ہو بلکہ میرا اندازہ ہے کہ ایکسائز و ٹیکسیشن وغیرہ میں ہی ہوگا۔ عافیہ کا تایا اس سے بہت بڑی بڑی رعایتیں حاصل کرنے کا آرزومند ہوسکتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایسا ہی ایک بہت بڑا کیس انڈیا میں سامنے آیا ہے۔ سونے کے تاجر ڈاڈا بجائی کا نام سنا ہوا ہے تم نے..." اس کے بعد حسنات صاحب نے ایک طولانی قصہ شروع کردیا۔ اس قصے میں مافیا بھی تھی اور تھوڑی تھوڑی انڈر ورلڈ بھی۔ ایک فرنچ کٹ داڑھی والا ڈان ٹائپ بندہ بھی تھا جس کی جڑیں آگے جاکر کہیں را اور موساد وغیرہ سے بھی ملتی تھیں۔ میرا سر گھوم کر رہ گیا۔

میں نے حسنات صاحب کو بتایا تھا کہ میں جہلم میں کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا۔ "اگر ہوٹل میں ہی ٹھہرنا ہے تو میرے گھر پر رہو۔ اگر تمہیں کوئی جھجک محسوس ہو رہی ہو تو بے شک پے انگ گیسٹ بن جاؤ۔ ابھی پچھلے دنوں پنجاب یونیورسٹی کے دو اسٹوڈنٹ میرے پاس رہ کر گئے ہیں۔ چار روز کے چار ہزار روپے دے رہے تھے، میں نے منع کیا مگر زبردستی جیب میں ڈال کر چلے گئے۔"

انہوں نے بالواسطہ مجھے بھاؤ تاؤ بھی بتادیا۔ میں نے نیم رضامندی ظاہر کردی۔ جناب حسنات نے بتایا تھا کہ بس اسٹینڈ پر ان کا ڈرائیور گاڑی لے کر آئے گا۔ ہمارے بس سے اترنے سے پہلے ہی ان کی گاڑی آچکی تھی مگر اسے گاڑی کہنے کے لیے کافی رعایت اور بہت سی چشم پوشی سے کام لینا پڑا۔ 1970ء کے لگ بھگ کا کوئی ماڈل تھا۔ جابجا مرہم پٹی کی گئی تھی۔ جس کو جناب نے ڈرائیور کا نام دیا تھا، وہ یقیناً ان کی اکیڈمی کا ہی کوئی ہونہار اسٹوڈنٹ تھا۔ اس کی مسیں بھیگے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ حسنات صاحب نے اس کا نام فاضل احمد بتایا۔

فاضل کو اس کی نشست سے ہٹا کر حسنات صاحب نے گاڑی خود ڈرائیو کی۔ میں نے ان کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھنے کا اعزاز حاصل کیا... ساتھ ساتھ جہلم شہر کا نظارہ بھی ہو رہا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے حسنات صاحب بار بار عقب نما آئینے پر نظر ڈالتے تھے بلکہ زیادہ تر وہ عقب نما آئینے میں ہی دیکھ رہے تھے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ اپنے تعاقب سے باخبر رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس نہایت سنجیدہ کوشش میں ایک بار انہوں نے گاڑی تقریباً ایک رکشے کے پیچھے ٹھونک دی اور دوسری مرتبہ غلط موڑ کاٹتے کاٹتے بچے۔

حسنات صاحب کا گھر انہی کی طرح آثارِ قدیمہ کا نمونہ تھا۔ عقبی احاطہ کھنڈر کا منظر پیش کرتا تھا۔ سامنے والے حصے میں چونکہ ان کی رہائش تھی اس لیے وہ قدرے بہتر حالت میں تھا۔ یہ گھر جائداد کی تقسیم میں ان کے بڑے بھائی نے انہیں دیا تھا۔ اب یہ گھر یقیناً اپنی بدقسمتی پر آنسو ٹپکاتا ہوگا۔

رات کھانے کے بعد حسنات صاحب نے میری داستانِ غم ایک بار پھر پوری تفصیل سے سنی اور عافیہ کی تلاش کے سلسلے میں مفید مشورے بھی دیے۔ وہ بار بار پوچھ رہے تھے کہ میں اپنی تلاش کس طرح شروع کرنا چاہتا ہوں اور کیا میرے ہاتھ میں کوئی چھوٹا موٹا سراغ ہے؟ انہیں یقین تھا کہ کوئی چھوٹا موٹا سراغ ضرور ہوگا۔ اس حوالے سے انہوں نے دو انگلش اور تین چار اردو ناولز کے حوالے دیے اور بتایا کہ لڑکی جب کہیں غائب ہوتی ہے تو اپنے پیچھے کوئی چھوٹا موٹا کلیو چھوڑ کر جاتی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی مرحوم دادی کی مثال بھی دی جو پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آئی۔

کچھ دیر بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے لاہور میں اس نیلی کار کی نمبر پلیٹ دیکھی تھی جس میں عافیہ کے تایا اسے جہلم لے کر آئے ہیں تو حسنات صاحب بے حد خوش ہوئے اور جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نمبر پلیٹ پوری نہیں پڑھ سکا، اس کے پہلے دو ہندسے ہی دیکھ سکا ہوں تو ان کی خوشی دیدنی ہوگئی۔ جوش سے آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھ گئی۔ یہ صورتِ حال ان کے جاسوسی مزاج کے عین مطابق تھی۔ ان کی ساری خفیہ حسیات بیدار ہوگئیں۔ پوچھا۔ "کیا پڑھا تھا تم نے؟"

میں نے بتایا۔ "جہلم... 38 اس سے آگے دو ہندسے اور تھے۔"

"زبردست... یعنی یہ سو کا پھیر ہے بلکہ ننانوے کا۔ 3801 سے لے کر 3899 تک کوئی نمبر بھی ہوسکتا ہے۔ گاڑی کا رنگ اور ماڈل کیا تھا؟"

"رنگ نیلا اور ماڈل میرے اندازے کے مطابق 2005ء کے آس پاس تھا۔"

حسنات صاحب نے سگریٹ سلگایا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولے۔ "اس کا مطلب ہے کہ مافیا... میرا مطلب ہے عافیہ کے تایا کے پاس ایک ایسی نیلی سوزوکی ہونی ہے جس کا نمبر 3801 سے لے کر 3899 کے درمیان ہے۔ ویری سمپل، ویری ویری سمپل بیٹا جی۔ یہاں ایکسائز کے رجسٹریشن آفس میں نادر منگو میرا دوست ہے۔ وہ ایسے سارے کام وہی کرتا ہے۔ فی گاڑی 300 روپے لیتا ہے مگر چونکہ یہاں لمبا آرڈر ہے قریباً ننانوے گاڑیوں کا ریکارڈ اسے دیکھنا ہوگا اس لیے میں اس سے رعایت کروالوں گا۔ چودہ پندرہ ہزار روپے میں مان جائے گا۔"

شدید قسم کی چرب زبانی کا مظاہرہ کرکے موصوف نے مجھ سے پانچ ہزار روپے اسی وقت وصول کرلیے۔ باقی پانچ چھ ہزار یا اس سے زائد کام ہونے کے بعد دینے طے پائے۔ بہرحال خوشی کی بات یہ تھی کہ میرے شدید شبہات کے باوجود رقم دینے کے بعد تیسرے روز یہ کام ہوگیا۔ دوپہر ایک بجے کے لگ بھگ حسنات صاحب نے بڑے جیمز بانڈ اسٹائل میں ایک لسٹ میرے سامنے رکھی۔ اس لسٹ میں کُل ننانوے گاڑیوں کی تفصیل تھی۔ ان ننانوے میں سے سوزوکی... سوئفٹ کاریں صرف چودہ تھیں۔ ان چودہ میں سے نیلگوں کاروں کی تعداد چھ تھی، یعنی اب ہمیں صرف چھ عدد کاروں کے مالکان کو دیکھنا تھا اور پتا کرنا تھا کہ ان میں سے عافیہ کے ساتھ کس کا تعلق تھا۔ ایک دفعہ عافیہ کے تایا ابو کا کھرا ہاتھ آجاتا تو پھر یہ پتا لگانا بھی اتنا مشکل نہیں تھا کہ عافیہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

حسنات صاحب اس چھان بین کے سلسلے میں بھی مجھ سے پوری فیس وصول کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ انہوں نے حیلے بہانوں سے مجھے بتایا کہ ان کی کھٹارا گاڑی کو اس بھاگ دوڑ کے سلسلے میں کتنا ایندھن درکار ہوگا اور اس میں کیا کیا رسک چھپے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی اشاروں کنایوں میں انہیں بتادیا کہ میں نہ صرف اپنے قیام و طعام کے اخراجات برداشت کروں گا بلکہ جو مزید تعاون وہ میرے ساتھ فرمائیں گے، اس کا مناسب معاوضہ بھی ادا کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس بُری بھلی گاڑی موجود تھی اور وہ اس شہر کے راستوں اور پیچ و خم سے بھی آشنا تھے۔ کافی حد تک سنکی ہونے کے باوجود وہ میرے لیے کارآمد ثابت ہوسکتے تھے۔

پچھلے دو دن سے میں ایک الجھن شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ حسنات صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ اس مکان کے عقبی حصے میں ایک اکیڈمی چلارہے ہیں۔ میں نے شام کے وقت اکیڈمی کے اسٹوڈنٹ بھی دیکھے تھے۔ یہ سب میٹرک یا فرسٹ ایئر سیکنڈ ایئر کے اسٹوڈنٹ لگتے تھے۔ میں نے انہیں، مکان کے عقبی حصے کی طرف ایک کلاس روم نما جگہ پر جاتے بھی دیکھا لیکن اس کے بعد اس کمرے سے کسی طرح کی کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ نہ ہی یہ اندازہ ہوا کہ وہاں کسی کو پڑھایا جارہا ہے۔ اس کے بجائے گھر کے عقبی احاطے کے کھنڈر نما کمروں سے ہلکی پھلکی آوازیں ضرور آتی رہتیں۔ یوں لگتا تھا کہ کلاس روم تو خالی ہے لیکن اس کے عقب میں کچھ ہو رہا ہے۔ دو دن تو میں نے یہ تجسس برداشت کیا پھر اس بھید کو پانے کے لیے اس راہداری میں گھسا جو عقبی حصے کی طرف جاتی تھی۔ حسنات صاحب نے مجھے ادھر جانے سے منع کیا تھا لیکن جب ہمارے جذبات منع

کرنے سے منع نہیں ہوئے تھے اور گندم کا دانہ جا چکھا تھا تو میں کیسے رک جاتا۔ تھوڑا بہت اثر شاید حسنات صاحب کی صحبت کا بھی تھا جو ہر وقت جاسوسی کہانیوں کا کردار بنے رہتے تھے۔

میں راہداری سے گزر کر عقبی حصے میں آیا۔ کلاس روم کے اندر جھانک کر دیکھا، وہ یکسر خالی تھا۔ ہمت کر کے میں مزید پیچھے چلا گیا۔ ایک دروازے کو بے آواز کھولتے ہوئے میں ایک طویل اور تاریک برآمدے میں داخل ہوا۔ یہاں ایک قطار میں کئی کھڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ پرانی طرز کی ان اکثر کھڑکیوں میں روشنی بھی تھی۔ ایک بند کھڑکی کے پیچھے سے ہا ہو کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ میں نے احتیاط سے چار پانچ ادھ کھلی کھڑکیوں میں جھانکا۔

مجھے عجیب و غریب مناظر نظر آئے۔ پہلے کمرے میں پانچ چھ اسٹوڈنٹ ایک طویل میز کے سامنے کھڑے تھے۔ میز پر مختلف قسم کے تالے رکھے تھے۔ یہ لڑکے ان تالوں کو ٹیڑھے میڑھے تاروں اور پیچ کش وغیرہ سے کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سے اگلے کمرے میں یقیناً جوڈو کراٹے ہو رہے تھے مگر یہ کھڑکی چونکہ بند تھی اس لیے میں بس ہا ہو کی آوازیں ہی سن پا رہا تھا۔ تیسرے کمرے کی کھڑکی میں بس تھوڑی سی درز موجود تھی۔ میں نے اندر جھانکا۔ اس ہال نما کمرے میں پختہ اینٹوں کی ایک دس بارہ فٹ اونچی دیوار بنائی گئی تھی اور اس پر کانچ کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ تین لڑکے اس دیوار کو مختلف طریقوں سے پھلانگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک لڑکا دوسرے کو کندھوں پر اٹھاتا تھا۔ وہ کندھوں پر کھڑا ہو جاتا تھا اور پھر دیوار پر لگے نکیلے کانچ پر کوئی جیکٹ یا بوریا وغیرہ ڈال کر دوسری طرف دھم سے کود جاتا تھا۔ حضرت حسنات صاحب بھی بطور انسٹرکٹر بنفس نفیس یہاں موجود تھے۔ میرے سامنے ہی انہوں نے ایک نو آموز لڑکے کے کان کھینچے اور پھر اسے خود دیوار پر سے کود کر دکھایا۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ حضرت یہاں علاقے کے من چلے لڑکوں کو جاسوسی کی تربیت دے رہے تھے۔ یعنی انہیں جیمز بانڈ، شرلاک ہومز، حمیدی فریدی اور پتا نہیں کیا کچھ بنا رہے تھے۔

دو تین کھڑکیاں چھوڑ کر ایک اور کھڑکی میں مجھے ایک رخنہ نظر آیا۔ یہاں سے جھانکا۔ یہ مکان کا ایک خستہ حال کمرا ہی تھا۔ یہاں موجود چار پانچ اسٹوڈنٹس میں سے ایک لڑکی بھی تھی۔ عمر تئیس چوبیس سال رہی ہو گی۔ اس نے جینز اور جوگرز پہن رکھے تھے۔ یہ سب لوگ ایک دروازے پر مشق فرما رہے تھے۔ دروازے کے اوپری حصے میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ وہ شیشے کو قلم سے کٹ لگاتے تھے پھر اس پر غالباً گوند والا کاغذ چپکاتے تھے اور اسے توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ لڑکی دلکش تھی۔ میں اس کے جسم کے پیچ و خم کو غور سے دیکھ رہا تھا، جب میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کسی وزنی چیز سے ضرب لگائی گئی تھی۔ آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی کوئی عقب سے کیکڑے کی طرح مجھ سے چمٹ گیا۔

''فاضل... انور... راجو...'' اس نے مدد کے لیے آوازیں دیں۔

میں جان گیا کہ یہ خود حسنات صاحب ہیں۔ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں کسی مخالف گروہ کا ناہنجار ایجنٹ نہیں، ان کا اپنا ہی پے انگ گیسٹ ہوں لیکن انہوں نے پیچھے سے میری گردن اتنے زور سے جکڑ رکھی تھی کہ میری آواز ہی نہیں نکل پائی۔ اپنے چھریرے جسم کے برعکس ان میں کافی زور تھا۔ جب میری سانس بالکل بند ہونے لگی تو میں نے بڑے ادب سے ایک ٹکر ان کی ناک پر جڑ دی۔ یہ ٹکر میں نے سر کے عقبی حصے سے لگائی تھی۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ ایک ہی ٹکر ان کا کام تمام کر دے گی۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح چت سے تاریک فرش پر گر پڑے اور ساکت ہو گئے۔

میں پلٹ کر ان پر جھکا۔ ''حسنات بھائی... حسنات بھائی۔'' میں نے پکارا اور انہیں جھنجوڑا۔

اسی دوران میں بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں تیزی سے میرے قریب آ گئیں۔ یہ سب حسنات صاحب کے ہونہار اسٹوڈنٹس تھے۔ فیمیل اسٹوڈنٹ نے جس کا نام بعد میں افشاں معلوم ہوا، تاریکی میں ڈھونڈ ڈھانڈ کر لائٹ کا سوئچ آن کیا اور اس طویل کھنڈر برآمدے میں زرد روشنی پھیل گئی۔ افشاں کے علاوہ دیگر طلبا نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ ہم سب حسنات صاحب کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ افشاں عرف افشی نے ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے۔ وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھے۔ کچھ دیر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے رہے، غالباً اپنے چکراتے دماغ کو سنبھال رہے تھے۔ تب یکایک انہوں نے غیر متوقع حرکت فرمائی۔ بیٹھے بیٹھے ایک دم میری ٹانگوں سے چمٹے اور زور لگا کر مجھے پشت کے بل گرا دیا۔ اس کے بعد پھرتی سے میرے سینے پر چڑھ بیٹھے اور میری گردن کو کوئی آرم لاک قسم کی چیز لگا دی۔

میں نے بالکل مزاحمت نہیں کی۔ تین چار سیکنڈ بعد وہ خود ہی میرے سینے سے اٹھ گئے اور ناصحانہ انداز میں بولے۔ ''آئندہ احتیاط رکھنا۔''

''یہ... یہ کیا ہوا تھا سر؟'' ہونہار اسٹوڈنٹ فاضل نے پوچھا۔

''ٹ... ٹریننگ تھی۔ چلو سب لوگ اپنی اپنی کلاسز میں جاؤ۔'' اسٹوڈنٹس کی ابھی پوری تشفی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تذبذب میں تھے، بہرحال وہ لوٹ گئے۔

حسنات صاحب کی پتلون اور سوئٹر گرد آلود فرش کی وجہ سے لتھڑ گئے تھے۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر بیرونی کمرے میں لے آئے۔ یہ کمرا اکیڈمی کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دروازہ بند کر کے مجھے صوفے پر بٹھایا۔ اپنے کپڑوں کی جھاڑ پونچھ کی۔ ان کی ناک کے پاس رخسار پر گومڑ سا نمودار ہو گیا تھا۔ کچھ دیر آئینے میں اسے دیکھتے رہے پھر دھیمی آواز میں بولے۔ ''بڑی بے وقوفی کی تم نے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ اس طرف نہیں آنا، اوپر سے تم نے یہ حرکت کر دی۔''

''مجھے اندھیرے میں بالکل پتا نہیں چلا حسنات بھائی کہ یہ آپ ہیں۔'' میں نے سفید جھوٹ بولا۔

''ٹھیک ہے جو کچھ ہوا، اس سے میری ساکھ تو خراب ہوئی ہے۔ اسٹوڈنٹس کے لیے استاد رول ماڈل ہوتا ہے... اب ہمیں، اس بات کو سنبھالنا ہے۔ وہ جو میں نے ٹریننگ والی بات کی تھی، اس پر قائم رہنا۔''

''ٹھیک ہے بھائی۔''

''اگر کوئی پوچھے تو کیا کہو گے اس سے؟''

''یہی کہ ہم... ٹریننگ کر رہے تھے بے ہوش ہونے کی۔''

''جتنے زور سے تم نے ٹکر ماری ہے تمہارا سر خالی تو ہونا چاہیے لیکن بات پھر بے وقوفی کی کر رہے ہو۔ بے ہوش ہونے کی ٹریننگ نہیں کر رہے تھے بلکہ بے ہوش بننے کی ٹریننگ۔ کوئی لڑکا پوچھے تو کہہ دینا کہ سر مجھے بتا رہے تھے۔ اندھیرے میں کوئی اچانک حملہ کر کے تم پر غالب آ جائے تو کس طرح تھوڑی دیر کے لیے بے ہوشی کا ڈراما رچانا ہے اور اس کے بعد دفعتاً اس کی ٹانگوں سے چمٹ کر اسے فرش پر گرانا ہے، یعنی کاؤنٹر اٹیک۔''

''ٹھیک ہے بھائی... ایسے ہی کہوں گا اور ایک بار پھر اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔''

''بس، اس غلطی کی تلافی یہی ہے کہ اس بات کو اب

پیاری بیوی

وہ کار میں موٹر وے پر چلا جا رہا تھا کہ ایک پولیس افسر نے تعاقب کر کے اسے ایک جگہ روک لیا۔

''ہاں جناب...! کیا مسئلہ ہے؟ کیوں روکا ہے مجھے؟''

''یہاں رفتار کی حد ساٹھ ہے... آپ اسّی کی رفتار پر جا رہے تھے۔''

''ہرگز نہیں... میں پچاس پر گاڑی چلا رہا تھا۔''

''اوہ ڈارلنگ!'' مسافر کی بیوی نے دخل اندازی کی۔ ''تم پورے سو کی رفتار پر گاڑی اڑا رہے تھے۔''

مسافر نے اپنی بیوی کو خشمناک نظروں سے گھورا۔

افسر نے کہا۔ ''اور تمہاری گاڑی کی عقبی لائٹ بھی ٹوٹی ہوئی ہے جو حادثے کا سبب بن سکتی ہے۔''

''اوہ... مجھے علم نہیں کہ وہ کب اور کیسے ٹوٹی۔''

''میں پچھلے تین ہفتوں سے تمہیں بتا رہی ہوں۔'' بیوی ایک بار پھر بولی۔ ''لیکن تمہارے پاس لائٹ بدلوانے کا وقت ہی نہیں ہے۔''

''اور تم نے سیٹ بیلٹ بھی نہیں باندھی ہوئی ہے۔'' افسر نے قدرے توقف کے بعد الزامات کی فہرست میں اضافہ کیا۔

''تم بائیک سے اترے تو میں نے بیلٹ کھولی تھی۔'' مسافر نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

''نہیں ڈارلنگ... تم کبھی بیلٹ نہیں باندھتے۔ یہ تمہاری عادت بن گئی ہے۔'' بیوی بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''بکواس بند کرو۔'' مسافر مڑ کر اپنی بیوی پر غرایا۔ ''ورنہ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔''

''کیا آپ کے شوہر آپ سے ہمیشہ اسی طرح بات کرتے ہیں؟'' افسر نے عورت سے پوچھا۔

''نہیں۔'' جواب ملا۔ ''بس نشے میں ہوتے ہیں تو ذرا غصہ دکھانے لگتے ہیں۔''

اوکاڑہ سے سعدیہ خاور کی معصومیت

سنبھالنا ہے اور بہتر ہے کہ آج سے تم بھی اسٹوڈنٹس میں شامل ہوجاؤ۔ تم نے دیکھ تو سب ہی کچھ لیا ہے۔ یہ اکیڈمی دراصل ایک طرح کا ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ ہے...“

انہوں نے اپنی آواز مزید دھیمی کرلی اور مجھے اس انسٹی ٹیوٹ کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگے۔ وہ اپنے تئیں اسکاٹ لینڈ کی طرز پر ایک بہت بڑا تفتیشی ادارہ بنانے کا ارادہ رکھتے تھے اور اس عظیم مقصد کی طرف اپنے پہلے قدم اٹھا چکے تھے۔ مادرِ وطن کو ہر قسم کے سماج دشمن عناصر، خفیہ تنظیموں اور مافیاز وغیرہ سے پاک کرنا ان کا اولین عزم تھا۔ اس عظیم مقصد کے پیشِ نظر وہ ہر طرح کی قربانی بھی دے رہے تھے۔ داخلہ فیس معاف تھی۔ ماہانہ فیس بھی کسی سے لی جارہی تھی اور کسی سے نہیں۔ بلکہ قمیل اسٹوڈنٹ کو تو وہ اپنے پلے سے بھی دینے پر تیار ہوجاتے تھے۔ اس کی ایک مثال افشاں تھی۔ اس نے کئی مہینے سے ایک روپیا فیس نہیں دی تھی بلکہ کھانے پینے کی مد میں اکثر ان کا خرچہ کروادیتی تھی۔ وہ بے آسرا لڑکی تھی۔ ماموں نے گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کے لیے حسنات بھائی کے دل میں نرم گوشہ موجود تھا بلکہ شاید نرم گرم گوشہ۔

اس روز میں بھی باقاعدہ اکیڈمی کے اسٹوڈنٹس میں شامل ہوگیا۔ حسنات بھائی کو چونکہ معلوم ہوچکا تھا کہ میں کھاتے پیتے گھرانے سے ہوں اور افورڈ کرسکتا ہوں اس لیے انہوں نے مجھ سے ٹکا کر فیس وصول کی یعنی دو ہزار روپے ماہانہ۔ کراٹے کی کلاس کے لیے وہ علیحدہ پانچ سو وصول کرنا چاہتے تھے لیکن میری درخواست پر انہوں نے مجھے اس کلاس سے استثنیٰ دے دیا۔ شاید انہیں اپنی ناک پر پڑنے والی دھواں دھار ٹکر بھی یاد آگئی تھی۔

میں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا شروع کردی۔ ساتھ ساتھ عافیہ کی تلاش کا کام بھی جاری ہوچکا تھا۔ ہم نے ٹوٹل چھ لوگوں تک پہنچنا تھا کہ ان میں سے عافیہ کے تایا ابو کون ہوسکتے ہیں۔ ان چھ میں سے کسی کار کے مالک کا نام مختار نہیں تھا۔ ممکن تھا کہ مختار گھر کے کسی اور فرد کا نام ہو یا پھر ہوسکتا تھا کہ عافیہ نے یہ نام ہی غلط بتایا ہو۔

حسنات بھائی کی کھٹارا کار پر ہم دو جگہوں پر تو جاچکے تھے۔ دونوں جگہوں پر ناکامی ہوئی تھی۔ پہلی کار ایک گجراتی کارخانے دار کی تھی۔ اس کی بیٹی ڈیڑھ دو سال کی تھی۔ اس کی کوئی بہن وغیرہ بھی نہیں تھی۔ یہ لوگ سیالکوٹی لہجے میں پنجابی بولتے تھے۔ دوسری گاڑی ایک سرکاری ملازم کی تھی۔ اس کی بیوی بچے کہیں نوشکی میں رہتے تھے اور وہ یہاں سروس کررہا تھا۔ یہ بندہ بھی ہرگز عافیہ کا تایا نہیں ہوسکتا تھا، نہ ہی یہاں سے کوئی اور سراغ ملا۔

اب چار ایڈریس مزید رہ گئے تھے۔ یقیناً ان میں سے ہی کوئی ادھیڑ عمر شخص ایسا تھا جو سرکاری افسر تھا۔ یہ عافیہ کا تایا ابو تھا اور عافیہ کو کہیں چھپا کر بیٹھا ہوا تھا۔ عافیہ کی آخری فون کال اور اس کی دلگیر آواز میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھی۔ یہ آواز جیسے مجھے پکارتی تھی اور کہتی تھی۔ ”کامران! کیا ہمارے ساتھ بھی وہی ہوگا جو اس سے پہلے نامبر عاشقوں کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے؟ کیا ہم بھی بچھڑ جانے کے لیے ملے تھے؟“

ایک روز سہ پہر کے وقت میں باہر کے دفتر نما کمرے میں بیٹھا تھا۔ حسنات بھائی اندر کراٹے اور نقل شکنی کی کلاسیں لینے میں مصروف تھے۔ اس کے بعد انہوں نے سیل فون کی کلاس لینا تھی۔ اس کلاس میں موبائل فون کے ذریعے خفیہ تصویر کشی، آڈیو ریکارڈنگ اور دیگر خرافات کی تربیت دی جاتی۔ آج میری صرف ایک کلاس تھی اس لیے مجھے باہر دفتر کی ڈیوٹی سونپ دی گئی تھی۔ دفعتاً ایک بھاری بھرکم شخص تند بگولے کی طرح اندر داخل ہوا۔ اس کی مونچھیں جیسے طیش سے پھڑپھڑا رہی تھیں اور آنکھوں میں خون کی سرخی تھی۔ ان حضرت کے ساتھ حسنات بھائی کا ہونہار شاگرد فاضل تھا۔ اس سترہ اٹھارہ سالہ اسٹوڈنٹ کے چہرے پر کئی ڈینٹ تھے۔ نچلا ہونٹ سوجا ہوا تھا، گریبان بھی چاک نظر آرہا تھا۔ مونچھیل شخص اندر آتے ہی دہاڑا۔

”کہاں ہے وہ تمہارا الو کا پٹھا پروفیسر؟“

”آ... آپ کون؟“

”اس سے کہو قاسم آیا ہے۔ تمہاری جان کو رونے کے لیے۔ اگر وہ خود باہر نہیں آیا تو میں اندر چلا جاؤں گا اور پھر لڑکوں کے سامنے اس کی وہ مٹی پلید ہوگی کہ منہ چھپاتا پھرے گا۔“

”وہ... تو اندر کلاس لے رہے ہیں۔ پڑھا رہے ہیں سیکنڈ ایئر والوں کو۔“

”بکومت۔“ وہ چنگھاڑا۔ ”مجھے پتا ہے کہ وہ لنگور کی اولاد کون سی کلاس لے رہا ہے۔ بیڑا غرق کررہا ہے محلے کے بچوں کا۔ جوکر اور بھانڈ بنا رہا ہے ان کو اپنی طرح۔ مجھے سارا پتا ہے اکیڈمی کے پیچھے جو چڑیا گھر کھول رکھا ہے اس کتے نے۔ بلاؤ اس کو نہیں تو میں جارہا ہوں اس کے کھوپڑے پر اینٹ مارنے۔“

میں ڈر کر اندر چلا گیا۔ عقبی حصے میں حسنات بھائی

نقوں کی ایک ٹولی کو نقلی داڑھی اور مونچھ وغیرہ لگانا سکھا رہے تھے۔ اس ریڈی میڈ میک اپ کے ذریعے شکل تبدیل کرنا بھی ان کی ٹریننگ میں شامل تھا۔ انہوں نے ... میں چھوٹے چھوٹے اسپرنگ پھنسا رکھے تھے جن کی وجہ سے ناک حیرت انگیز طور پر چوڑی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے جب انہیں آفت کی اطلاع دی تو ان کا رنگ ہلدی ہوگیا۔ بے ساختہ فرمایا۔ ”بھائی صاحب آئے ہیں۔“

انہوں نے جلدی جلدی داڑھی مونچھ چہرے سے علیحدہ کی اور بال درست کرتے ہوئے ساتھ چل دیے۔ جسم پر ... سا طاری تھا۔ گھبراہٹ میں ناک کے اندر سے اسپرنگ نکالنا بھول گئے تھے۔ اس کی وجہ سے ناک مضحکہ خیز نظر آرہی تھی۔ میں بتانا چاہ رہا تھا لیکن اسی دوران میں ہم قاسم صاحب کے روبرو پہنچ گئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہی حسنات بھائی کے بڑے بھائی ہیں جن کا نام سن کر وہ اکثر ... بلال کو پڑھتے رہتے ہیں۔

اپنے ہونہار شاگرد کی درگت دیکھ کر حسنات بھائی کچھ گھبرا گئے۔ ”یہ... یہ کیا ہے بھائی جان؟“ انہوں نے پوچھا۔

”یہی تو میں پوچھ رہا ہوں تجھ سے کہ یہ کیا ہے... یہ سب؟“ قاسم صاحب چنگھاڑے۔

”میں سمجھا نہیں۔“

”تو نے تباہ کردیا ہے علاقے کے بچوں کو۔ مجھے نہیں لگتا تو زیادہ دیر جیل سے باہر رہ سکے گا۔ بہت بُری حالت ہے تیری... بہت بُری۔ اور یہ ناک میں کیوں پھلا رہا ہے ... نظر تجھی کراچی۔“

”ہم... مگر بھائی جان اس کو کیا ہوا ہے؟ میرا مطلب ہے کیا کیا ہے اس نے؟“ وہ ہکلائے۔

”یہ پوچھ اس نے کیا نہیں کیا۔ اس کے ہوش ٹھکانے ... ہے۔ کھانے پینے کا اس کو ہوش نہیں ہے۔ پڑھائی ... چھوٹ چکی ہے۔ محلے بھر سے گالیاں یہ کھا رہا ہے اور ... نوبت تھانے کچہری تک چلی گئی ہے۔“

”تھ... تھانے تک... میں ابھی آیا۔“ حسنات بھائی تیزی سے باہر نکل گئے۔ قاسم صاحب نے انہیں پکارا ... انہوں نے سنی اَن سنی کردی۔ میں سمجھا کہ وہ کسی واقف ... کو فون کرنے یا مدد کے لیے بلانے گئے ہیں لیکن بعد میں پتا چلا کہ وہ ذرا باتھ روم تک گئے تھے۔

مونچھیل قاسم صاحب زبردست پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ میں نے انہیں نارمل کرنے کے لیے جلدی سے جوس منگوایا۔ دراز میں سے آلو کے چپس نکال کر ان کے سامنے رکھے۔ دو چار محبت بھری باتیں کیں اور ہولے سے انہیں بتایا کہ اس نامعقول اکیڈمی وغیرہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں تو لاہور سے ایک مہمان کی حیثیت سے یہاں آیا ہوں۔ ویسے ہی شومئی قسمت دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ قاسم صاحب کا غصہ تو رفع نہیں ہوا مگر اس میں اتنی کمی ضرور واقع ہوگئی جتنی آج کل پیٹرول کی قیمتوں میں ہوتی ہے۔ میرے استفسار پر انہوں نے آگ بگولے لہجے میں بتایا۔ ”یہ فاضل میرے محلے دار ارشاد بھٹی کا بیٹا ہے۔ چند مہینے پہلے تک اچھا بھلا تھا پھر اس لنگور کے ہتھے چڑھ گیا۔ اب یہ تقریباً دیوانہ ہے۔ گھر میں سگی ماں کو کہتا ہے کہ وہ کسی مافیا کے ہتھے چڑھی ہوئی ہے، اس لیے اس سے پہلے جیسا سلوک نہیں کرتی۔ باپ کو کبھی اسمگلر اور کبھی ایف آئی اے کا ایجنٹ قرار دیتا ہے۔ چند دن پہلے اس کی بہن سسرال سے آئی ہوئی تھی۔ اس کے فون کی سم کہیں چھت پر گرگئی۔ وہ رات کو ٹارچ کی مدد سے سم ڈھونڈ رہی تھی۔ اس نے فتویٰ لگادیا کہ یہ ہیروئن فروشوں کے مقامی گروہ سے ملی ہوئی ہے۔ چھپ چھپ کر باتیں کرتی ہے۔ رات کو چھت پر چڑھ کر گروہ کے سرغنہ کو ٹارچ کی مدد سے خفیہ اشارے دیتی ہے۔ بڑے بھائی نے اس بات پر تھپڑ مارا تو جواباً اس کی زیرِ ناف ایسا گھونسا رسید کیا کہ بے چارے کا اپنڈکس پھٹ گیا۔ وہ چار دن اسپتال میں پڑا رہا۔ عقل ملاحظہ کرو... عقل ملاحظہ کرو اس سور کی۔“ طیش میں آکر مونچھیل قاسم صاحب اپنی جگہ سے اچھلے اور ایک زوردار جھانپڑ فاضل کی گدی پر مارا۔ وہ کرسی سے گرتے گرتے بچا لیکن بولا کچھ نہیں۔

قاسم صاحب نے کچھ وقت سانسیں درست کرنے میں لگایا پھر بولے۔ ”مجھے تو اس حرام زادے کی وہ ساری خبیث حرکتیں یاد بھی نہیں آرہیں جو اس لنگور کی ٹریننگ کی وجہ سے اس نے کی ہیں۔ پچھلے سے پچھلے ہفتے کی بات سن لو۔ اس کا تایا رات کو دیر سے گھر آیا۔ اس نے کندھے پر لکڑی کا ایک چھوٹا ستار رکھا ہوا تھا۔ گھر میں بجانے کے لیے لایا تھا۔ اس نے کھڑکی کھول کر صحن میں دیکھا پھر گھر کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور گلی کے چوکیدار کو بتایا کہ کوئی مشکوک بندہ ان کے گھر میں راکٹ لانچر لے کر گھوم رہا ہے۔ عقل ملاحظہ کرو... عقل ملاحظہ کرو... اوئے کسی نابینا عورت کے بچے، تجھے لکڑی اور راکٹ لانچر میں فرق نظر نہیں آتا؟“ وہ خاموش رہا۔

”راکٹ لانچر۔“ قاسم صاحب نے ایک بار پھر

دانت پیس کر کہا اور ایک اور جھانپڑ فاضل کی گردن پر لگایا۔ اس مرتبہ وہ پھر کرسی سے گرتے گرتے بچا۔

وہ سانسیں درست کر کے بولے۔ ”چلو، یہ باتیں گھر کے اندر تک ہی رہتیں تو بھی گوارا تھیں مگر اب تو اس خبیث کا خبط گھر سے باہر بھی نکل آیا ہے۔ محلے میں ایک مولوی صاحب ہیں، کچھ ہی عرصہ پہلے کرایہ دار کے طور پر آئے ہیں۔ یہ پتا نہیں کہاں سے باتیں نکال کر لے آتا ہے۔ ان کے بارے میں کہتا پھرتا ہے کہ یہ دراصل ہندو ہیں۔ انہوں نے بھیس بدلا ہوا ہے۔ یہ دہشت گردی وغیرہ کے چکر میں یہاں آئے ہیں۔ عقل ملاحظہ کرو... عقل ملاحظہ کرو اس ہونہار کھوجی کی۔ لوگ اس کی باتوں پر ہنستے ہیں مگر اس کا خبط کم ہونے کے بجائے بڑھتا رہا۔ اب آج اس نے کیا کیا ہے۔ پوچھو، ذرا اس سے پوچھو۔“ عقل ملاحظہ کرو ان کا تکیہ کلام تھا۔

میں نے زخمی فاضل کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنی گردن کچھ مزید جھکالی۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ قاسم صاحب زہر خند لہجے میں بولے۔ ”مولوی صاحب کا سات آٹھ سال کا ایک بیٹا ہے۔ جناب آج اسے کھینچ کر ایک کمرے میں لے گئے، یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ اس کی مسلمانی ہوئی ہے یا نہیں۔ عقل ملاحظہ کرو... ایک ہزار بے وقوفوں کو جمع کرو تو یہ اس کی ایک انگلی کے برابر نہیں ہیں۔ لوگ تو بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں اور یہاں تو پہلے ہی بتنگڑ بلکہ بتنگڑو تھا۔ لڑکے کا شور سن کر آس پاس کے دکان دار جمع ہوگئے۔ یہ اندر لڑکے سے کھینچا تانی فرما رہے تھے۔ اب کیا سمجھے ہوں گے لوگ۔ انہوں نے مار مار کر اس کا دنبہ بنا دیا۔ وہ تو سیدھا تھانے لے جا رہے تھے۔ خوش قسمتی سے اس کا باپ وہاں پہنچ گیا۔ اس نے فون کر کے مجھے بلا لیا۔ سو پاپڑ بیلے ہیں تو اس الو کے پٹھے کی جان چھوٹی ہے لوگوں سے...“

بات کرتے کرتے قاسم کو ایک دم حسنات کا خیال آیا۔ وہ پھنکار کر بولے۔ ”اب کہاں دفع ہو گیا ہے وہ فساد کی جڑ۔ کہیں دیوار شیوار پھاند کر تو نہیں نکل گیا؟“

میں کیا کہہ سکتا تھا۔ دیوار شیوار پھاندنے میں تو حضرت ماسٹر تھے۔ بہرحال وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پتا چلا کہ حسنات صاحب اس چار دیواری میں کہیں بھی نہیں ہیں۔ طوفان کے آثار دیکھ کر انہوں نے کسی مناسب جگہ سے راہِ فرار اختیار کر لی تھی۔ قاسم صاحب کا پارا ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ انہوں نے چھوٹے بھائی پر غائبانہ گالیوں کی بوچھاڑ کی۔ اس سے ایسے ایسے رشتے جوڑے جو کسی صورت وقوع پذیر ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ پھر انہوں نے دھکا دے کر دفتر کا اندرونی دروازہ کھولا اور دندناتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ کی طرف بڑھے۔ برآمدے میں ہی انہیں ایک لٹھ پڑی نظر آگئی۔ آثار سے لگتا تھا کہ وہ اس لٹھ کو پولیس کے اختیارات کی طرح بے دریغ استعمال کریں گے اور اپنے سامنے والی ہر شے کو توڑ پھوڑ ڈالیں گے مگر اسی دوران میں حسنات صاحب کی کیمیل شاگرد ایک میل شاگرد کے ہمراہ آگے بڑھی۔ ان نے منت سماجت کر کے قاسم صاحب کا راستہ روکا۔ میں بھی ہمت کر کے اس کارِ خیر میں شریک ہو گیا اور ہم کسی نہ کسی طرح قاسم صاحب کو واپس دفتر میں لانے میں کامیاب ہوئے۔ قاسم صاحب نے چنگھاڑتے ہوئے آخری نوٹس دے دیا اور ہمیں پابند کیا کہ ہم یہ نوٹس حسنات تک پہنچا دیں۔ اس نوٹس کے مطابق حسنات صاحب کو دس دن کے اندر اندر اپنا یہ کباڑ خانہ ختم کرنا تھا یا پھر دما دم مست قلندر کے لیے تیار ہو جانا تھا۔

☆☆☆

شروع میں تو ایسا ہی لگا تھا کہ بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی میں پانی پت چھڑ جائے گی مگر دو تین بعد محسوس ہوا کہ صورتِ حال کسی حد تک کنٹرول میں آگئی ہے۔ ایک دو ساتھی اسٹوڈنٹس کی زبانی بھی مجھے پتا چلا کہ قاسم صاحب اور حسنات بھائی میں ون ٹو ون ملاقات ہوئی ہے اور قاسم صاحب کا پارا کچھ نیچے آگیا ہے۔

ہم نیلی کار والے چار مالکان کو ٹٹول چکے تھے، اب پانچویں کی باری تھی۔ اس کا نام شاہد محمود تھا اور وہ ایک ڈاکٹر تھا۔ اس سے ملنا اور اس کی ٹوہ لینا کافی آسان تھا۔ شاہد محمود گھر میں بھی شام کے وقت کلینک چلاتا تھا۔ ہم بطور مریض اس کے پاس جا سکتے تھے اور اس میں ایسا جھوٹ بھی کیا تھا۔ مریضِ عشق تو میں تھا ہی۔ بات صرف سات آٹھ سو روپے فیس کی تھی اور میں یہ بھرنے کے لیے تیار تھا۔

ہم سہ پہر کے وقت حسنات صاحب کی مجوبہ کار میں نکلے اور جی ٹی روڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر شاہد محمود کی کوٹھی اسی علاقے میں تھی۔ ہم نے ایک جگہ سینما کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کی۔ اس سے آگے ہمیں پیدل جانا تھا۔ ہم ایک بھری پُری سڑک سے گزر رہے تھے جب حسنات بھائی بُری طرح چونکے۔ انہیں اپنے عقب میں کوئی بندہ نظر آیا تھا۔ میں نے بھی مڑ کر دیکھا۔ یہ شلوار قمیص والا ہٹا کٹا شخص تھا اور ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا تیزی سے حسنات بھائی کی طرف آ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ ہاتھ سے کچھ اشارے بھی کر رہا تھا۔ حسنات بھائی کا رنگ اڑ گیا۔ میرا ہاتھ تھام کر تیز رفتاری سے چلنے لگے اور پھر سرِ راہ ایک ہوٹل میں گھس گئے۔

”کون ہے یہ؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک... ایجنسی کا بندہ ہے۔“ وہ ہکلائے۔

ہوٹل میں رش تھا۔ حسنات بھائی سیدھے باتھ روم کی طرف گئے اور ایک میں داخل ہو گئے۔ میں سٹپٹایا ہوا وہیں کھڑا رہا۔ وہ ہٹا کٹا شخص دندناتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مجھ پر بھی اس کی نظر پڑی لیکن اس نے صرف حسنات بھائی کو ہی دیکھا تھا اور اب انہی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ سخت طیش میں تھا۔ اس نے ہر طرف نظر دوڑائی پھر تن کر ہوٹل کے بیرونی دروازے پر کھڑا ہو گیا۔

”یا اللہ خیر۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

کچھ دیر بعد باتھ روم کا دروازہ کھلا۔ میں دنگ رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ حسنات بھائی خالی باتھ روم میں داخل ہوئے ہیں مگر اس میں سے تو ایک اور بھائی صاحب بھی نکل آئے تھے۔ ان کی کھچڑی داڑھی اور ہونٹوں پر جھکی ہوئی بھاری مونچھیں تھیں۔ انہوں نے نیلے رنگ کا ایک ڈبی دار کوٹ پہن رکھا تھا اور ناک کافی چپٹی تھی۔

میں حیرت زدہ ان کی طرف دیکھ رہا تھا جب انہوں نے میرے کان میں فرمایا۔ ”چلو آ جاؤ۔“

میں اچھل کر رہ گیا۔ یہ حسنات بھائی ہی تھے۔ واہ، کیا جاسوسی کہانیوں جیسا دھوبی پٹکا مارا تھا انہوں نے۔ حقیقی زندگی میں تو ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ میں واقعی ششدر رہ گیا۔ انہوں نے اپنا کوٹ الٹ کر پہن لیا تھا۔ اسے دونوں طرف سے پہنا جا سکتا تھا۔ بڑی نفیس داڑھی مونچھ چپکالی تھی اور ناک میں وہی اسپرنگ پھنسا لیے تھے جو شکل کو کیا سے کیا بنا دیتے تھے۔ رہی سہی کسر موٹے شیشوں کی عینک نے پوری کر دی تھی جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں دوگنا بڑی نظر آ رہی تھیں۔

وہ بڑے اعتماد سے ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھے اور ہٹے کٹے شخص کے پاس سے گزرتے ہوئے... ہجوم میں شامل ہو گئے۔ میں ان سے ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔ جیسا کہ دو تین دن بعد معلوم ہوا، یہ ہٹا کٹا شخص کسی ایجنسی کا بندہ نہیں تھا بلکہ ایک چھوٹی سی موبائل فون شاپ چلاتا تھا۔ اس سے حسنات صاحب وقتاً فوقتاً ایزی لوڈ کرواتے رہتے تھے۔ اپنی چرب زبانی کی بدولت وہ اس سے چھ ماہ سے اب تک ادھار قریباً ڈھائی ہزار کا ایزی لوڈ کروا چکے تھے اور نادہندہ بنے ہوئے تھے۔ بہرحال ابھی یہ قصہ ختم نہیں ہوا۔ تبدیل شدہ حلیے کے ساتھ ہم ہوٹل سے آدھ پون کلومیٹر دور ہی آئے ہوں گے کہ ایک گوشے سے دو افراد عقاب کی طرح حسنات بھائی پر جھپٹے اور انہیں اٹھا کر ایک پھل فروش کی ریڑھی پر دے مارا۔ وہ ان کو گریبان سے کھینچ رہے تھے اور چلّا رہے تھے۔ شور سن کر دو افراد مزید آگئے اور اس کارِ خیر میں شمولیت اختیار کی۔ گندم کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔ ایک زوردار گھونسا مجھے بھی لگا۔ کچھ لوگوں نے درمیان میں آکر بیچ بچاؤ کروایا۔ حسنات بھائی کی داڑھی ایک طرف سے کھسک گئی تھی جسے انہوں نے بائیں ہاتھ سے دبا رکھا تھا اور ظاہر یہی کر رہے تھے کہ یہاں چوٹ لگی ہے۔ کسی نہ کسی طرح وہ داڑھی کو اس کے اصل مقام پر رکھنے میں کامیاب رہے۔ کھینچا تانی میں ان کی ناک کے ایک نتھنے میں سے اسپرنگ بھی نکل گیا تھا۔ اب ایک طرف سے پچکی ہوئی ناک مزید مضحکہ خیز لگنے لگی تھی۔ یہ لوگ حسنات بھائی پر مسلسل چلّا رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں مناسب جگہوں پر ناقابلِ اشاعت گالیاں بھی شامل تھیں۔ جو کچھ میری سمجھ میں آیا، اس سے مجھے یہی پتا چلا کہ حسنات بھائی کو آڑے ہاتھوں لینے والا ایک قریبی موٹر ورکشاپ کا ہیڈ مستری ہے۔ حسنات بھائی نے پچھلے سال اس ورکشاپ سے اپنی کھٹارا کا انجن تبدیل کروایا تھا اور پھر لمبی ٹرائی کا بہانہ کر کے نکل لیے تھے۔

بڑی نازک صورتِ حال تھی۔ پولیس کو بلانے تک نوبت آسکتی تھی۔ حسنات بھائی لرزتے کانپتے میری طرف آئے اور ایک طرف لے جا کر دھیرے سے بولے۔ ”تمہارے پاس چھ ہزار روپے ہوں گے؟“

خوش قسمتی سے اتنے روپے میری جیب میں موجود تھے۔ میں نے یہ روپے حسنات بھائی کو دیے۔ کافی تگ و دو کے بعد انہوں نے ورکشاپ کے بپھرے ہوئے مالک اور ہیڈ مستری سے اپنی جان چھڑائی۔

جاسوسی اور چھان بین کا سارا مزہ کرکرا ہو چکا تھا۔ اس لیے ہم اپنا آج کا مشن ادھورا چھوڑ کر واپس ٹریننگ سینٹر کی طرف چل دیے۔ راستے میں، میں نے حسنات بھائی سے پوچھا۔ ”یہ کیسے ہو گیا حسنات بھائی؟“

وہ بولے۔ ”اسی کو کہتے ہیں بیڈ لک۔ بھیس بدل کر ہم ایجنسی کے بندے (ایزی لوڈ والے) سے تو بچ گئے مگر یہ جو دوسری پارٹی ہے اس نے پہچان لیا۔ دراصل انہوں نے مجھے اسی داڑھی مونچھ والے روپ میں دیکھا ہوا تھا۔“

''یعنی اگر آپ اپنے اصل حلیے میں ہوتے تو ان سے بچ جاتے؟''

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور اداس بکرے کی طرح گردن جھکالی۔ نازک صورت حال کے باوجود میں بمشکل اپنی ہنسی روک سکا۔ جسے وہ بیڈ لک کہہ رہے تھے، وہ دراصل شامت اعمال تھی۔ کھینچا تانی کے دوران میں ان کا پاؤں بری طرح مڑ گیا تھا اور وہ لنگڑا کر چل رہے تھے۔ اس موچ کی وجہ سے میرے لیے بڑی مناسب صورت حال پیدا ہوئی۔ اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ بہرحال باقی سارے راستے میں حسنات بھائی مجھے یہ باور کروانے کی کوشش کرتے رہے کہ ورکشاپ والوں نے بالکل ناجائز پیسے لیے ہیں۔ وہ انہیں مزہ چکھا سکتے تھے لیکن صرف اس لیے چپ رہے کہ اس لڑائی کی وجہ سے ایک مقامی مافیا کو زبردست فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ مافیا کا لفظ وہ جگہ جگہ اتنے تواتر سے استعمال کرتے تھے کہ اب تو میرے منہ سے بھی کسی وقت عافیہ کی جگہ بے ساختہ مافیا نکل جاتا تھا اور دیکھا جائے تو عافیہ کے جابر خیالات نے کسی مافیا ہی کی طرح ہمہ وقت مجھے گھیرا ہوا تھا۔ اس کی یادیں رات کے اندھیرے میں شب خون مارتی تھیں اور مجھے لہولہان کردیتی تھیں۔

اگلے دو دن حسنات بھائی نے اپنی چوٹوں کی ٹکور کرنے میں گزارے۔ اس دوران میں ایک بار قاسم صاحب بھی اکیڈمی میں تشریف لائے۔ ان کا پارا بالکل ٹھنڈا نظر آرہا تھا۔ انہوں نے حسنات بھائی سے بھی سیدھے منہ بات کی۔ چائے کی چسکیاں بھی لیں۔ جلد ہی مجھے اس کایا پلٹ کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ حسنات بھائی کی چمکیلی اسٹوڈنٹ یعنی لیڈی کمانڈو افشاں قاسم بھائی کے آگے پیچھے گھوم رہی تھی۔

حسنات بھائی کے ایک شاگرد انور عرف کھل نائیک نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''حسنات بھائی کا پھینکا ہوا کانٹا نگل لیا ہے قاسم بھائی نے۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ چالاک عورت ارسطو جیسے دانشور کو بھی گھوڑا بنا کر اس پر سواری کرسکتی ہے۔''

انور عرف کھل نائیک نے اس روز مجھے افشاں کے بارے میں مزید باتیں بھی بتائیں۔ پتا چلا کہ یہ بی بی اکیڈمی کے اولین شاگردوں میں سے ہے۔ شروع شروع میں حسنات بھائی کا ارادہ تھا کہ اس سے شادی فرمائیں گے اور چند سالوں میں تیزی سے بچے پیدا کرکے اپنے گھر کی ہی ایک سیکرٹ سروس بنالیں گے مگر یہ بی بی بے راہ رو نکلی۔ ٹریننگ کے بعد اس نے سماج دشمن عناصر کو کچلنے کے بجائے چوریاں شروع کردیں۔ آٹھ دس ماہ تک غائب رہی پھر ایک روز پتا چلا کہ سرائے عالمگیر کی ایک حوالات میں بند ہے۔ حسنات بھائی نے بمشکل اس کی ضمانت کروائی۔ اب یہ پھر ٹریننگ وغیرہ لے رہی ہے مگر اب اس سے شادی کا خیال حسنات بھائی نے دل سے نکال دیا ہے۔

چند روز کے اندر ہی افشاں نے قاسم بھائی کا سارا زہر نکال دیا تھا۔ وہ ریشہ خطمی ہورہے تھے بلکہ ایک دن تو انہوں نے ہماری اکیڈمی کا سرسری سا دورہ بھی فرمایا۔ ہم اپنی ٹریننگ میں مصروف تھے۔ میری قفل شکنی کی کلاس ہورہی تھی۔ حسنات بھائی ہم دو لڑکوں کو بتارہے تھے کہ ہشتمی قفل میں اندر کی طرف لگی ہوئی چابی کو کس طرح باہر نکالا جاتا ہے۔ انہوں نے دروازے کی نچلی درز میں سے ایک چوڑا اخبار اندر گھسا دیا تھا اور ایک آہنی سلائی سے چابی کو چھیڑ کر اسے اخبار پر گرانے کی کوشش فرمارہے تھے۔ فربہ اندام قاسم بھائی افشاں کی معیت میں اندر داخل ہوئے۔ کچھ دیر خاموشی سے معائنہ کرتے رہے پھر جوڈو کراٹے کی کلاس کی طرف نکل گئے۔ ان کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سارے بکھیڑے کو نالائقی کا عروج سمجھتے ہیں لیکن چشم پوشی کررہے ہیں۔ تیز طرار افشاں انہیں ساتھ ساتھ بریفنگ بھی دے رہی تھی۔ میں نے قاسم صاحب کو شروع میں بتایا تھا کہ میں اکیڈمی کے شاگردوں میں شامل نہیں۔ اب یہ جھوٹ بھی کھل گیا تھا۔ بہرحال افشاں کے ہوتے ہوئے اب کوئی ڈر خطرے والی بات نہیں تھی۔ وہ اپنی شوخ حرکتوں سے ادھیڑ عمر قاسم صاحب کو کم از کم... وقتی طور پر تو مسمرائز کرنے میں کامیاب تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ایک بار قاسم صاحب کی ٹویوٹا پر مشکوک قسم کی لانگ ڈرائیو پر بھی جاچکی ہے۔

تیسرے دن مجھے اکیلے ہی نیلی کاروالی تفتیش پر نکلنا پڑا۔ ورکشاپ والوں کی عزت افزائی کے بعد حسنات صاحب کے پاؤں میں جو موچ آئی تھی، وہ ابھی پوری ٹھیک نہیں ہوئی تھی اور یوں وہ ابھی تک خود کو ریٹائرڈ ہرٹ تصور کررہے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک احمق شاگرد کا خستہ حال اسکوٹر مجھے فراہم کردیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ اس اسکوٹر کا کرایہ بھی اپنے بل میں ایڈجسٹ کریں گے۔ نیلی کار والے جس پانچویں ایڈریس پر مجھے پہنچنا تھا، وہ مجھے ازبر ہوگیا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، یہ ایک شاہد محمود نامی ڈاکٹر صاحب تھے۔ میں بطور مریض ان کے پاس حاضری

دے سکتا تھا اور کلینک کے کسی ملازم سے مزید ٹن گن بھی لے سکتا تھا لیکن یہ ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔

وہ کچھ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ ابھی میں کلینک کے قریب ہی پہنچا تھا کہ دو افراد کلینک میں سے نکلتے نظر آئے۔ میرے سر پر جیسے کسی نے سوکلو کا بم پھوڑ دیا تھا۔ ان دو افراد میں سے ایک تو فربہ اندام قاسم صاحب تھے۔ دوسری سرو قد اور آہو چشم عافیہ تھی۔ وہ قدرے کمزور بلکہ بیمار نظر آتی تھی۔ قاسم صاحب کے ساتھ سر جھکا کر چلتی وہ ان کی ٹویوٹا کار میں بیٹھی۔ دونوں وہاں سے روانہ ہوگئے۔ میں نے اپنے سرپٹ دوڑتے دل کو بمشکل سنبھالا اور اسکوٹر پر ٹویوٹا کار کے پیچھے روانہ ہوگیا۔

پندرہ منٹ کا یہ سفر رہائشی علاقے کی ایک کوٹھی پر ختم ہوا۔ گیٹ پر قاسم جاہ کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ بالآخر میں نے مافیا... میرا مطلب ہے عافیہ کا سراغ پالیا تھا لیکن ذہن میں بہت سے سوالات بھی ابھر رہے تھے جن میں سے اہم ترین سوال یہی تھا کہ قاسم بھائی سے مافیا... میرا مطلب ہے عافیہ کا کیا تعلق ہے؟ پھر ایک خیال بجلی کی طرح ذہن میں کوندا، کہیں یہی تو عافیہ کے تایا جان نہیں ہیں؟ عین ممکن تھا کہ اس نے ان کا نام غلط بتایا ہو، اگر ایسا تھا تو پھر یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اس نے اپنا نام بھی غلط بتایا ہو۔

اسی دوران میں میں نے ایک نوجوان پٹھان لڑکے کو کوٹھی میں سے نکلتے دیکھا۔ اس کے حلیے سے ظاہر تھا کہ وہ چوکیدار یا گھریلو ملازم ہے۔ وہ سائیکل پر ایک طرف روانہ ہوا۔ میں نے اسکوٹر اس کے پیچھے لگادیا۔ وہ ایک ٹینٹ سروس والے کے پاس جارکا۔ میں بھی اسکوٹر سے اتر کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ وہ ٹینٹ سروس والے سے کوٹھی کی پیمائش اور شامیانوں وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کررہا تھا۔ میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ کہیں یہ... کہیں یہ عافیہ کی شادی کی تیاریاں ہی تو نہیں تھیں؟ منہ خشک ہوگیا، سینہ سلگ اٹھا۔ میں اب زیادہ انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ لڑکا معلومات لے کر فارغ ہوچکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر لڑکے سے علیک سلیک کی۔

''میں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''جی فرمائیں، ام سن رہا ہے۔''

''یہاں نہیں برادر! اہم بات ہے، بیٹھ کر کرنے والی ہے۔''

بے نیازی

ایک صاحب مجسٹریٹ کے پاس کچھ کاغذات کی تصدیق کرانے گئے۔

''سکونت کہاں ہے؟'' مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔

''کس کی...... میری؟''

''ہاں، آپ کی۔''

''برنس روڈ۔''

''کیا کام کرتے ہیں؟''

''کون؟ میں؟''

''ہاں... ہاں... آپ!''

''ایک سرکاری ادارے میں ملازم ہوں۔''

''عمر کیا ہے؟''

''کس کی؟ میری؟''

''نہیں میری۔'' مجسٹریٹ نے جھلا کر کہا۔

''میرا خیال ہے آپ کی عمر چوالیس پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔'' نہایت اطمینان سے جواباً کہا گیا۔

کراچی سے عائشہ خرم کی قلفتگی

وہ ذرا تذبذب میں رہنے کے بعد بیٹھ گیا۔ میں نے سٹپٹا کر کہا۔ ''یہاں نہیں بیٹھنا برادر، آؤ میرے ساتھ۔''

قریباً دس پندرہ منٹ بعد ہم ایک قریبی ریستوران میں بیٹھے دودھ پتی پی رہے تھے اور سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ رحیم نامی یہ لڑکا کافی عرصے سے قاسم بھائی کا گھریلو ملازم تھا۔ بہرحال آج کل وہ ان سے بہت ناراض تھا۔

رحیم کو مکمل طور پر شیشے میں اتارنے میں مجھے آدھ پون گھنٹا مزید لگا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں لاہور میں اسے اپنی قالین فیکٹری میں زبردست ملازمت دے سکتا ہوں اور اس کے دن پھر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوشش کرکے میں نے اسے تھوڑی نقدی بھی دی۔ دھیرے دھیرے رحیم گل نے بولنا شروع کردیا۔ اس کی گفتگو سے مجھ پر پے در پے انکشافات ہوئے۔ پہلا انکشاف تو یہی تھا کہ قاسم بھائی ہی عافیہ کے تایا ابو ہیں اور دوسرا انکشاف یہ تھا کہ عافیہ کا وہ نام جس سے اسے پکارا جاتا ہے، عافیہ نہیں مہناز ہے۔ عافیہ کا تو کسی کو پتا بھی نہیں تھا۔ یہ نام اس کے دادا

مرحوم نے رکھا تھا یعنی پورا نام مہناز عافیہ تھا لیکن استعمال مہناز ہی ہوتا تھا اور اب پرسوں اس کی شادی کی رسم دھوم دھام سے انجام دی جارہی تھی۔

دیگر لوگوں کی طرح رحیم گل کو بھی معلوم تھا کہ مہناز عافیہ کی شادی اس کی مرضی و منشا کے بغیر کی جارہی ہے اور اس میں اس کے تایا کا مطلب پوشیدہ ہے۔ وہ اپنے امیر کاروباری دوست سے رشتے داری بنا کر کاروباری فائدے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھید بھی کھلا کہ عافیہ نے احتیاطاً اپنے تایا ابو کا اصل نام ہی نہیں اصل کام بھی چھپایا تھا۔ وہ سرکاری ملازم نہیں بلکہ سرکاری ٹھیکے دار تھے۔ گورنمنٹ کنٹریکٹر کے طور پر مختلف تعمیرات کے ٹھیکے لیتے تھے۔ شاید انہوں نے کوئی ایک آدھ سڑک بھی بنائی ہو۔

رحیم گل نے ایک اور اہم انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ”چھوٹی بی بی نے کچھ دن پہلے گھر سے بھاگنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس کے بعد سے قاسم صاحب نے اس کو کوٹھی کے ایک پچھلے کمرے میں بند کر چھوڑا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شادی کے بعد ہی اسے وہاں سے نکالے گا۔“

”لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے تو میں نے ان دونوں کو کہیں باہر سے آتے دیکھا ہے؟“

”خو، وہ چھوٹی بی بی کو ڈاکٹر شاہد صاحب کے پاس لے کر گیا تھا اس کے دوا دارو کے لیے۔ یہ ڈاکٹر شاہد ٹھیکے دار صاحب کا گہرا دوست ہے نا۔“

ایک دم میرے ذہن میں نیا خیال آیا۔ میں نے پوچھا۔ ”اچھا... کبھی ایسا بھی ہوا ہے، ٹھیکے دار صاحب نے ڈاکٹر شاہد کی کار استعمال کی ہو؟ میرا مطلب ہے، ایک دو دن کے لیے ان کی کار کہیں لے کر گئے ہوں؟“

رحیم گل نے اپنا گرم ٹوپی اتار کر سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں جی، کبھی کبھار ہو جاتا ہے۔ ایسا ابھی پچھلے ہی دنوں ہوا۔ ٹھیکے دار جی چھوٹی بی بی صاحبہ کو لاہور لینے کے لیے ڈاکٹر جی کی کار پر ہی گیا تھا۔ اس کا اپنا گاڑی ذرا خراب تھا۔“

اب ساری بات سمجھ میں آرہی تھی۔ کڑی سے کڑی مل گئی تھی۔ ٹھیکے دار قاسم بھائی ڈاکٹر شاہد کی کار پر لاہور سے عافیہ کو لینے گئے تھے اور میں نے اس کار کا ادھورا نمبر پڑھا تھا۔

رحیم گل، ٹھیکے دار قاسم بھائی کے ذاتی معاملات سے خوش نہیں تھا۔ اسے ان کے چال چلن کے حوالے سے بھی شکایات تھیں۔ اب یہ بات بھی اس کے لیے تکلیف دہ تھی کہ جناب نے ایک ایسی لڑکی سے عشق لڑانا شروع کر دیا ہے جو ان کی بھتیجی عافیہ سے دو چار سال ہی بڑی ہوگی۔ رحیم گل کا اشارہ یقیناً حسنات بھائی کی فیمیل اسٹوڈنٹ افشاں کی طرف تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ چور چوری سے باز آبھی جائے تو ہیرا پھیری سے باز نہیں آتا۔ یہ لڑکی ماہر سراغ رساں بننے بننے بڑے پائے کی نوسرباز بن گئی تھی۔

بہرحال ان ساری باتوں کا تعلق مجھ سے نہیں تھا۔ مجھ سے تو عافیہ کا تعلق تھا اور اس زبردستی کی شادی کا تعلق تھا جو دو روز بعد ہونے جارہی تھی۔ رحیم گل کی باتوں سے صاف پتا چلتا تھا کہ عافیہ اس شادی سے ہرگز خوش نہیں ہے۔ اس نے اپنے تایا کے شکنجے سے نکلنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی اور اب بیمار پڑی ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جس آگ میں میں سلگ رہا ہوں، وہ بھی اس میں جل رہی ہے۔ اب مجھے کچھ کرنا تھا اور فوری طور پر کرنا تھا۔ اب تو میں حسنات بھائی سے مدد بھی نہیں مانگ سکتا تھا۔ ان کے تو گمان میں نہیں تھا کہ میں جس لڑکی کو ڈھونڈنے یہاں وارد ہوا ہوں اور جگہ جگہ کی خاک چھان رہا ہوں؛ وہ ان کی بھتیجی ہے اور ان کے جابر بڑے بھائی کی تحویل میں ہے۔

رحیم گل معصوم تھا لیکن اتنا نہیں۔ اس کے ذہن میں یقیناً کھد بد جاری تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ میں ٹھیکے دار قاسم بھائی کی بھتیجی کے سلسلے میں اتنی دلچسپی کیوں ظاہر کر رہا ہوں؟ آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

”کامران بھائی، ام پوچھنا چاہتا ہے کہ چھوٹی بی بی سے آپ کا کیا تعلق ہے؟“

”بڑا پاک تعلق ہے رحیم گل۔“

”کیا چھوٹی بی بی آپ کا بہن ہے؟“

جی چاہا کہ چائے دانی اس کے سر پر دے ماروں۔ وہ شادی سے پہلے ہی میرا نکاح توڑنا چاہ رہا تھا۔ میں نے مناسب الفاظ میں اسے سمجھایا کہ اس کے علاوہ بھی بہت سے پاک رشتے ہوتے ہیں جن میں ایک دوسرے کا دکھ درد دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا جاتا ہے۔

میں سمجھ گیا کہ رحیم گل میری جتنی مدد کر سکتا تھا، کر چکا ہے۔ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ اب اس گھر میں جو کچھ بھی کرنا تھا، مجھے اکیلے ہی کرنا تھا۔ میں نے تیزی سے منصوبہ بندی شروع کر دی۔

☆☆☆

وہ جہلم کی ایک سرد رات تھی۔ دریا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ یہی کوئی بارہ بجے کا وقت ہوگا۔ میں

محترم حسنات بھائی کے فراہم کردہ اسکوٹر پر خاموشی سے نکلا اور اسی کوٹھی میں پہنچ گیا جس کے گیٹ پر ٹھیکے دار قاسم جاہ کے نام کی پلیٹ لگی تھی۔ میں حسنات بھائی کی ٹریننگ کے مطابق دن کے وقت بڑی اچھی طرح کوٹھی کا حدود اربعہ دیکھ چکا تھا۔ کوٹھی کے عقب میں دو خالی پلاٹ تھے اور گھاس وغیرہ اگی ہوئی تھی۔ میں اسکوٹر کو بند کر کے ان پلاٹس کی طرف لے گیا۔ اسکوٹر کو اسٹینڈ پر دیوار کے بالکل ساتھ کھڑا کیا۔ اسکوٹر پر کھڑا ہوا تو دس گیارہ فٹ اونچی دیوار تک آسانی سے ہاتھ پہنچ گیا۔ دیوار کے بالائی کنارے پر لوہے کا جنگلا تھا جس پر برچھیاں سی لگی ہوئی تھیں۔ حسنات بھائی کی کلاس میں پڑھا ہوا سبق مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ میں نے اپنی وزنی جیکٹ کو دہرا کر کے برچھیوں پر رکھا اور ان کی کاٹ سے بچتا ہوا دھم سے تاریک صحن میں کود گیا۔ سبق نمبر 12 کی مثال نمبر 3 کے مطابق کچھ دیر وہیں بیٹھا سن گن لیتا رہا پھر پنجوں کے بل چلتا ہوا اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ میری جیب میں جو چیزیں تھیں، ان میں ایک رومال تھا جو ایک شاپر میں اچھی طرح لپیٹا گیا تھا۔ ایک مڑا تڑا تار تھا۔ کچھ چابیاں اور اس طرح کی دیگر اشیا تھیں۔ سب سے پہلے میرا واسطہ ایک آہنی قفل سے پڑا۔ خوش قسمتی سے قفل میں اندر کی طرف چابی موجود تھی۔ میری آنکھوں کی چمک دگنی ہو گئی۔ اپنی ٹریننگ آزمانے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے جیکٹ کی جیب سے ایک مڑا تڑا اخبار نکالا اور اسے سیدھا کر کے دروازے کی نچلی درز سے اندر گھسا دیا۔ اس کے بعد جیب سے ایک آہنی کیل نکالی اور کیل کی مدد سے چابی کو چھیڑا۔ وہ اندر کی طرف پھیلے ہوئے اخبار پر گری۔ میں نے اخبار باہر کھینچ لیا۔

”واہ استاد جی۔“ دل سے بے ساختہ آواز نکلی۔

میں نے چابی سے قفل کھولا اور اندر چلا گیا۔ یہاں میں نے ایک کھڑکی کا شیشہ حسنات بھائی کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق توڑا۔ پہلے شیشہ کاٹنے والے قلم سے شیشے پر ایک چوکور کٹ لگایا پھر اس کٹ پر گوند والا کاغذ چپکایا اور ہاتھ سے ہلکی سی چوٹ لگا کر شیشہ توڑ دیا۔ شیشہ چونکہ کاغذ سے چپکا ہوا تھا لہٰذا اندر نہیں گرا اور اس کے گرنے سے شور بھی پیدا نہیں ہوا۔ میں نے خلا میں ہاتھ ڈال کر اندر سے چٹخنی کھول دی اور ایک مستطیل کمرے میں گھس گیا۔ سچ کہتے ہیں کہ محنت انسان کو سونا بنا دیتی ہے اور اگر اچھا استاد بھی مل جائے تو سونے پر سہاگا ہو جاتا ہے۔

کل رحیم گل کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ عافیہ ٹی وی لاؤنج کے ساتھ والے کمرے میں سوتی ہے اور اس کمرے سے باہر لاؤنج میں محترم تایا صاحب کا بستر ہوتا ہے۔ پورے گھر میں تازہ رنگ و روغن کی بو تھی۔ یہ رنگ و روغن بھی یقیناً شادی کی تیاریوں کا حصہ تھا۔ ٹی وی لاؤنج کے ایک سرے پر مجھے ٹھیکے دار قاسم بھائی کا بیڈ نظر آ گیا۔ میں نے انہیں ان کے تن و توش سے پہچانا۔ وہ سرتاپا لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ میں نے جیکٹ کی جیب سے شاپر بیگ نکالا۔ اس میں کلوروفارم سے بھیگا ہوا رومال موجود تھا۔ حسنات بھائی نے لیکچر کے دوران بتایا تھا کہ جاسوسی دنیا کے سارے سپر اسٹارز یعنی علی عمران کرنل فریدی حمیدی اور میجر پرمود وغیرہ اسی طرح کے رومال سونگھا سونگھا کر مجرموں کو بے ہوش کرتے تھے اور پھر ان کو اغوا کر کے قارئین سے تاوان وصول کرتے تھے۔ حسنات بھائی کی تربیت کے عین مطابق میں قاسم بھائی کے سرہانے پہنچا۔ رومال کو چٹکی میں پکڑا، لحاف کا سرا ذرا سا اٹھایا اور رومال کو ہولے ہولے اس جگہ لہرانا شروع کیا جہاں میرے اندازے کے مطابق ان کی ناک تھی۔ اس ساری کمانڈو کارروائی کے دوران میں بس یہیں پر مجھ سے تھوڑی سی غلطی ہوئی تھی۔ لحاف کی وجہ سے مجھے پتا نہیں چلا۔ قاسم بھائی کا سر دوسری طرف تھا اور میں پاؤں کی طرف رومال لہرا رہا تھا۔ جب اچانک پرلی جانب سے موصوف نے لحاف میں سے سر نکال کر مجھے دیکھا تو میں خود بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف اور حیرت کا دریا بہنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ چلّاتے یا اس طرح کی کوئی اور نامعقول حرکت کرتے، میں کرکٹر جونٹی روڈز کی سی پھرتی سے ان پر جا پڑا۔ رومال میں نے بڑی سختی سے ان کے باڑ جیسے منہ میں گھسا دیا اور نتھنوں سمیت پورے چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ وہ کافی جسیم اور زور آور تھے مگر جو کچھ ہوا، ڈرون کی سی پھرتی سے ہوا تھا۔ وہ مزاحمت بھی اتنی ہی دکھا سکے جتنی ہم ڈرون پر دکھاتے ہیں۔

وہ بے ہوش ہو گئے۔ کمرے کی چابی مجھے ان کے تکیے کے نیچے سے مل گئی۔ مقفل کمرے کو کھولنے سے پہلے میں نے تصدیق کی کہ اندر عافیہ ہی ہے۔ کی ہول میں سے اس کی لرزتی کانپتی آواز سنائی دی تو میں نے قفل کھول دیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ میں اور آپ کئی رومانی فلموں میں دیکھ چکے ہیں لیکن سین دیکھنے اور سین کا حصہ ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ جذباتی معانقہ، وہ تڑپ، وہ گرمی، وہ گداز یہ سب کچھ لفظوں میں

بیان نہیں کیا جاسکتا۔

''میرے ساتھ چلوگی؟'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''ہاں۔''

''کہاں تک؟''

''جہاں تک تم کہو۔'' اس نے کہا اور چہرہ میری جیکٹ میں چھپالیا۔

جی چاہا کہ اس سے پوچھوں کیا وہاں تک چلوگی جہاں تک راجیش کھنہ لے کر گیا تھا۔ شرمیلا ٹیگور کو فلم ارادھنا میں اور گاتا گیا تھا روپ تیرا مستانہ لیکن یہ نازک وقت ایسے جذبات انگیز سوالوں کا نہیں تھا۔ ہم وہاں سے نکل آئے۔ کچھ دیر بعد میں حسنات کے فراہم کیے ہوئے اسکوٹر پر ہی ان کی بھتیجی کو بٹھا کر وہاں سے لے جا رہا تھا۔

اس سے آگے کہانی میں دو تین موڑ جلدی جلدی آئے اور کہانی ختم ہوگئی۔ اگلے ہی روز ہم دونوں نے کورٹ میں جاکر شادی کرلی۔ اسی روز میں نے گھر والوں کو اپنے اعتماد میں لے کر اور انہیں اپنی مجبوریاں بتا کر اس شادی سے آگاہ کردیا اور انہوں نے اس شادی کو قبول بھی کرلیا۔ اب مجھے کوئی ڈر یا خطرہ نہیں تھا۔ عافیہ کے وارث قاسم بھائی کتنا بھی اودھم مچا لیتے، قبلہ والد صاحب بہ آسانی ان سے نمٹ سکتے تھے۔ ویسے بھی جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔

شادی کے تیسرے دن میں نے اپنے دو دوستوں کے سنگ بیٹھے بیٹھے ٹی وی نیوز میں ایک فوٹیج دیکھی اور اس فوٹیج نے اس سارے قصے کا مزہ دوبالا کردیا۔ نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ ''کل جہلم کے ایک رہائشی مکان میں بھڑکنے والی آگ کے حوالے سے ایک فوٹیج ہمیں مل گئی ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ یہ آگ دو سگے بھائیوں کے باہمی تنازعے کا نتیجہ تھی اور جان بوجھ کر لگائی گئی تھی۔''

میں منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ فوٹیج میں سرخ دائرے کے ذریعے جس شخص کو دکھایا گیا، وہ یقیناً فربہ اندام قاسم بھائی ہی تھے۔ موصوف ایک بڑی لٹھ لے کر حسنات بھائی کی جاسوسی اکیڈمی میں گھسے ہوئے تھے۔ ہر طرف توڑ پھوڑ مچا رہے تھے پھر انہوں نے کلوروفام اور اسپرٹ وغیرہ کی بوتلوں کو آگ دکھادی۔

تب ایک دوسرے دائرے میں حسنات بھائی کو دکھایا گیا۔ دونوں سرخ دائرے آگے پیچھے دوڑے۔ قاسم بھائی والا دائرہ پیچھے تھا۔ قاسم بھائی نے لٹھ گھما کر حسنات بھائی کی تشریف پر رسید کی پھر دوسری پھر تیسری۔ حسنات بھائی پھرتی سے دیوار پر چڑھ گئے اور دوسری طرف کود گئے، یہ سڑک تھی۔ شومئی قسمت ایک بھونڈ رکشا تیزی سے آیا اور حسنات بھائی سے ٹکرایا۔ یہ چوٹ بھی غالباً وہیں پر لگی جہاں لٹھ کی چوٹیں لگی تھیں۔ حسنات بھائی دور تک لڑھک گئے اور واویلا کرنے لگے۔ لوگ ان کے گرد جمع ہو چکے تھے۔

☆☆☆

ان واقعات کو اب تین چار ماہ گزر چکے تھے۔ میں اور عافیہ ہنسی خوشی رہ رہے ہیں۔ میں اسے عافیہ ہی کہتا ہوں۔ رحیم گل ہماری قالین فیکٹری میں اچھی ملازمت کررہا ہے۔ افشاں کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اس نے پھر منحرف ہوکر چوریاں وغیرہ شروع کردی ہیں۔ قاسم بھائی پر آتش زنی کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے اور ان کی بیوی روٹھ کر میکے بیٹھی ہوئی ہے۔ حسنات بھائی نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ مل کر پراپرٹی کا کام شروع کردیا ہے۔ دریائے جہلم کے خشک راستے پر کہیں انہوں نے کوئی کالونی بنانے کا پروگرام ترتیب دیا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ جگہ دریا کے اندر ہی واقع ہو۔ کہتے ہیں کہ چھٹتی نہیں منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ حسنات صاحب بھی جاسوسی اور سنسنی خیزی کے خول سے پوری طرح باہر نہیں نکلے۔ پچھلے دنوں ان کی مجوزہ کالونی کا ایک بروشر میری نظروں سے گزرا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

''جمعا کا ٹاؤن... ایشیا میں اپنی طرز کا پہلا رہائشی منصوبہ۔ ہر پلاٹ قبضہ مافیا کی دسترس سے دور۔ انڈر ورلڈ کے لوگوں سے بھی تقریباً سارے معاملات طے۔ اسکول، مسجد، جاسوسی اکیڈمی، کراٹے سینٹر، دہشت گردی سے تائب ہوجانے والوں کے لیے ایک مکمل علیحدہ بلاک۔ ٹاؤن کی اپنی بجلی، اپنا پانی، گیس کے لیے بھی اپنا کنواں کھودا گیا ہے اور الحمدللہ گیس بھی نکل آئی ہے (اگر واقعی ایسا تھا تو یقیناً انہوں نے سوئی ناردرن والوں کا کوئی پائپ پھوڑا ہوگا) ٹاؤن میں سیکیورٹی کا زبردست انتظام ہے۔ چالیس فٹ اونچی چار دیواری، مین گیٹ اور دیگر گیٹس پر مشین گنوں والے خونخوار قبائلی چوکیدار۔ گلیوں میں رات کے وقت خوفناک شکلوں والے جسیم کتے چھوڑے جائیں گے جو ذرا سے شک پر ہر مقامی و غیر مقامی شخص کو پھاڑ کھائیں گے، انشاء اللہ...''

تو قارئین... میں یہی کہہ سکتا ہوں عقل ملاحظہ کریں... عقل ملاحظہ کریں...!